۴۔ اقتصادی نظام

انسان کی معاشی زندگی کو انصاف اور راستی پر قائم رکھنے کے لئے اسلام نے چند اصول اور چند حدود مقرر کر دیے ہیں تاکہ دولت کی پیدائش، استعمال اور گردش کا سارا نظام انہی خطوط کے اندر چلے جو اس کے لئے کھینچ دیئے گئے ہیں۔ دولت کی پیداوار کے طریقے اور اس کی گردش کی صورتیں کیا ہوں، اسلام کو اس سوال سے کوئی بحث نہیں ہے۔ یہ چیزیں تو مختلف زمانوں میں تمدن کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ بنتی اور بدلتی رہتی ہیں۔ ان کا تعین انسانی حالات و ضروریات کے لحاظ سے خود بخود ہو جاتا ہے۔ اسلام جو کچھ چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام زمانوں اور حالات میں انسان کے معاشی معاملات جو شکلیں بھی اختیار کریں ان میں یہ اصول مستقل طور پر قائم رہیں اور ان حدود کی لازماً پابندی کی جائے۔

اسلامی نقطہ نظر سے زمین اور اس کی سب چیزیں خدا نے نوعِ انسانی کے لئے بنائی ہیں، اس لئے ہر انسان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ زمین سے اپنا رزق حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس حق میں تمام انسان برابر کے شریک ہیں۔ کسی کو اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ نہ کسی کو اس معاملے میں دوسروں پر ترجیح ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ کسی شخص یا نسل یا طبقے پر ایسی کوئی پابندی از روئے شرع جائز نہیں ہو سکتی کہ وہ رزق کے وسائل میں سے بعض کو استعمال کرنے کا حق دار ہی نہ رہے، یا بعض پیشوں کا دروازہ اس کے لئے بند کر دیا جائے۔ اسی طرح ایسے امتیازات بھی شرعاً قائم نہیں ہو سکتے جن کی بنا پر کوئی ذریعۂ معاش یا وسیلۂ رزق کسی مخصوص طبقے یا نسل یا خاندان کا اجارہ بن کر رہ جائے۔ خدا کی بنائی ہوئی زمین پر اس کے پیدا کئے ہوئے وسائلِ رزق میں سے اپنا حصہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا سب انسانوں کا یکساں حق ہے اور اس کوشش کے مواقع سب کے لئے یکساں کھلے ہونے چاہئیں۔

قدرت کی جن نعمتوں کو تیار کرنے یا کارآمد بنانے میں کسی کی محنت و قابلیت کا کوئی دخل نہ ہو

وہ سب انسانوں کے لئے مباحِ عام ہیں۔ ہر شخص کو حق ہے کہ اپنی ضرورت بھر ان سے فائدہ اٹھائے۔ دریاؤں اور چشموں کا پانی، جنگل کی لکڑی، خودرو درختوں کے پھل، خود رو گھاس اور چارہ، ہوا اور پانی اور صحرا کے جانور، سطح زمین پر کھلی ہوئی کانیں، اس قسم کی چیزوں پر نہ تو کسی کی اجارہ داری قائم ہو سکتی ہے، اور نہ ایسی پابندیاں لگائی جا سکتی ہیں کہ بندگانِ خدا کچھ دیئے بغیر ان سے اپنی ضرورتیں پوری نہ کر سکیں۔ ہاں، جو لوگ تجارتی اغراض کے لئے بڑے پیمانے پر ان میں سے کسی چیز کو استعمال کرنا چاہیں ان پر ٹیکس لگایا جا سکتا ہے۔

خدا نے جو چیزیں انسان کے فائدے کے لئے بنائی ہیں انہیں لے کر بیکار ڈال رکھنا صحیح نہیں ہے۔ یا تو ان سے خود فائدہ اٹھاؤ، ورنہ چھوڑ دو تاکہ دوسرے ان سے متمتع ہوں۔ اسی اصول کی بنا پر اسلامی قانون یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین کو تین سال سے زیادہ مدت تک افتادہ حالت میں نہیں رکھ سکتا۔ اگر وہ اس کو زراعت یا عمارت یا کسی دوسرے کام میں استعمال نہ کرے تو تین سال گزر جانے کے بعد وہ متروکہ زمین سمجھی جائیگی، کوئی دوسرا شخص اسے کام میں لے آئے تو اس پر دعوٰے نہ کیا جا سکے گا، اور اسلامی حکومت کو بھی یہ اختیار ہوگا کہ اس زمین کو کسی کے حوالے کر دے۔[1]

---

[1] امام ابو یوسف رحمۃ اللہ اپنی کتاب الخراج میں طاؤس کے حوالہ سے یہ حدیث نقل فرماتے ہیں:۔

عادی الارض للہ وللرسول ثم لکم من بعد فمن احیا منہا شیئاً فہی لہ ولیس لمحتجر حق بعد ثلاث سنین	افتادہ زمین (جس کے مالک باقی نہ رہے ہوں) خدا اور رسول کی ہے اور اس کے بعد تمہاری۔ اور جو شخص کسی افتادہ زمین کو آباد کرے وہ اسی کی ہو جائیگی۔ اور بیکار ڈال رکھنے والے کو زمین پر تین سال کے بعد کوئی حق نہ رہے گا۔

پھر امام صاحب حضرت سالم بن عبد اللہ اور زہری کے واسطے سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں منبر پر کھڑے ہو کر اعلان فرمایا تھا کہ۔

جو شخص براہ راست قدرت کے خزانے میں سے، کوئی چیز لے اور اپنی محنت و قابلیت سے اس کو کار آمد بنائے وہ اس چیز کا مالک ہے۔ مثلاً کسی افتادہ زمین کو جس پر کسی کے حقوق ملکیت ثابت نہ ہوں اگر کوئی شخص اپنے قبضے میں لے لے اور کسی مفید کام میں اسے استعمال کرنا شروع کر دے تو اس کو بیدخل نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی نظریے کے مطابق دنیا میں تمام مالکانہ حقوق کی ابتدا اسی طرح ہوئی ہے۔ پہلے پہل جب زمین پر انسانی آبادی شروع ہوئی تو سب چیزیں سب انسانوں کے لئے مباح عام تھیں۔ پھر جس جس شخص نے جس مباح چیز کو اپنے قبضے میں لے کر کسی طور پر کار آمد بنا لیا وہ اس کا مالک ہو گیا، یعنی اسے یہ حق حاصل ہو گیا کہ اس کا استعمال اپنے لئے مخصوص رکھے اور دوسرے اسے استعمال کرنا چاہیں تو ان سے اس کا معاوضہ لے۔ یہ چیز انسان کے سارے معاشی معاملات کی فطری بنیاد ہے اور اس بنیاد کو اپنی جگہ قائم رہنا چاہیئے۔

جائز شرعی طریقوں سے جو مالکانہ حقوق کسی کو دنیا میں حاصل ہوں وہ بہرحال احترام کے مستحق ہیں۔ کلام اگر ہو سکتا ہے تو اس امر میں ہو سکتا ہے کہ کوئی ملکیت شرعاً صحیح ہے یا نہیں۔ جو ملکیتیں از روئے شرع ناجائز ہوں انہیں بے شک ختم ہو جانا چاہیئے۔ مگر جو ملکیتیں شرعاً صحیح ہوں کسی حکومت

من احیا ارضاً میتۃ فھی لہ ولیس لمحتجر حق بعد ثلث سنین

جو شخص کسی افتادہ زمین کو آباد کرے وہ اسی کی ہو جائیگی اور بے کار ڈال رکھنے والے کو تین سال گزر جانے کے بعد کوئی حق نہ رہیگا۔

لہ مذکورۂ بالا احادیث سے استدلال کرتے ہوئے امام ابو یوسف فرماتے ہیں:۔

"ہمارے نزدیک (یعنی حنفیہ کے نزدیک) جس افتادہ زمین پر پہلے سے کسی کا حق مالکانہ قائم نہ ہو اور کوئی شخص اسے آباد کر لے تو وہ اسی کی ملک ہو جائیگی۔ اسے حق ہے کہ خواہ اس میں خود زراعت کرے یا دوسرے کو زراعت پر دے یا اجرت پر کاشت کرائے اور اس میں پانی کی نالیاں نکالے یا اور کوئی ایسا کام اس میں کرے جو اس زمین کی بہتری کے لئے ہو۔" (کتاب الخراج صفحہ ۳۷)

اور کسی قانون ساز مجلس کو یہ حق نہیں ہے کہ انہیں سلب کرے یا ان کے مالکوں کے شرعی حقوق میں کسی قسم کی کمی بیشی کرے۔ اجتماعی بہتری کا نام لے کر کوئی ایسا نظام قائم نہیں کیا جا سکتا جو شریعت کے دیئے ہوئے حقوق کو پامال کرنے والا ہو۔ جماعت کے مفاد کے لئے افراد کی ملکیتوں پر جو پابندیاں شریعت نے خود لگا دی ہیں ان میں کمی کرنا جتنا بڑا ظلم ہے اتنا ہی بڑا ظلم ان پر اضافہ کرنا بھی ہے۔ یہ بات اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ افراد کے شرعی حقوق کی حفاظت کرے اور ان سے جماعت کے وہ حقوق وصول کرے جو شریعت نے ان پر عائد کئے ہیں۔

خدا نے اپنی نعمتوں کی تقسیم میں مساوات ملحوظ نہیں رکھی ہے بلکہ اپنی حکمت کی بنا پر بعض انسانوں کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ حسن، خوش آوازی، تندرستی، جسمانی طاقتیں، دماغی قابلیتیں، پیدائشی ماحول، اور اسی طرح کی دوسری چیزیں سب انسانوں کو یکساں نہیں ملیں۔ ایسا ہی معاملہ رزق کا بھی ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی فطرت خود اس بات کی متقاضی ہے کہ انسانوں کے درمیان رزق میں تفاوت ہو۔ لہٰذا وہ تمام تدبیریں اسلامی نقطۂ نظر سے مقصد اور اصول میں غلط ہیں جو انسانوں کے درمیان ایک مصنوعی معاشی مساوات قائم کرنے کے لئے اختیار کی جائیں۔ اسلام جس مساوات کا قائل ہے وہ رزق میں مساوات نہیں بلکہ حصولِ رزق کی جدوجہد کے مواقع میں مساوات ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سوسائٹی میں ایسی قانونی اور رواجی رکاوٹیں باقی نہ رہیں جن کی بنا پر کوئی شخص اپنی قوت و استعداد کے مطابق معاشی جدوجہد نہ کر سکتا ہو، اور ایسے امتیازات بھی قائم نہ رہیں جو بعض طبقوں، نسلوں اور خاندانوں کی پیدائشی خوش نصیبی کو مستقل قانونی حقوق میں تبدیل کر دیتے ہوں۔ یہ دونوں طریقے فطری نامساوات کی جگہ زبردستی ایک مصنوعی نامساوات قائم کرتے ہیں، اس لئے اسلام انہیں مٹا کر سوسائٹی کے معاشی نظام کو ایسی فطری حالت پر لے آنا چاہتا ہے جس میں ہر شخص کے لئے کوشش کے مواقع کھلے ہوں۔ مگر جو لوگ چاہتے ہیں کہ کوشش کے ذرائع اور نتائج میں بھی سب لوگوں کو زبردستی برابر کر دیا جائے، اسلام ان سے متفق نہیں ہے، کیونکہ وہ فطری نامساوات کو مصنوعی مساوات میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ فطرت سے قریب تر نظام صرف وہی ہو سکتا ہے جس میں ہر شخص معیشت کے میدان میں اپنی

دوڑ کی ابتدا اسی مقام اور اسی حالت سے کرے جس پر خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ جو موٹر لئے ہوئے آیا ہے وہ موٹر ہی پر چلے، جو صرف دو پاؤں لایا ہے وہ پیدل ہی چلے، اور جو لنگڑا پیدا ہوا ہے وہ لنگڑا کر ہی چلنا شروع کرے۔ نہ سوسائٹی کا قانون ایسا ہونا چاہیے کہ وہ موٹر والے کا مستقل اجارہ موٹر پر قائم کر دے اور لنگڑے کے لئے موٹر کا حصول ناممکن بنا دے، اور نہ ایسا ہی ہونا چاہیے کہ سب کی دوڑ زبردستی ایک ہی مقام اور ایک ہی حالت سے شروع ہو اور آگے تک انہیں لازماً ایک دوسرے کے ساتھ باندھ رکھا جائے۔ برعکس اس کے قوانین ایسے ہونے چاہئیں جن میں اس امر کا کھلا امکان موجود رہے کہ جس نے اپنی دوڑ لنگڑا کر شروع کی تھی وہ اپنی محنت و قابلیت سے موٹر پا سکتا ہو تو ضرور پائے اور جو ابتدا میں موٹر پر چلا تھا وہ بعد میں اپنی نااہلی سے لنگڑا ہو کر رہ جائے تو رہ جائے۔

اسلام صرف اتنا ہی نہیں چاہتا کہ اجتماعی زندگی میں معاشی دوڑ کھلی اور بے لاگ ہو بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس میدان میں دوڑنے والے ایک دوسرے کے لئے بے رحم اور بے درد نہ ہوں، ہمدرد اور مددگار ہوں۔ وہ ایک طرف اپنی اخلاقی تعلیم سے لوگوں میں یہ ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ اپنے درماندہ اور پسماندہ بھائیوں کو سہارا دیں۔ دوسری طرف وہ تقاضا کرتا ہے کہ سوسائٹی میں ایک مستقل ادارہ ایسا موجود رہے جو معذور اور محروم اور بے وسیلہ لوگوں کی مدد کا ضامن ہو۔ جو لوگ معاشی دوڑ میں حصہ لینے کے قابل نہ ہوں وہ اس ادارے سے اپنا حصہ پائیں، جو لوگ اتفاقات زمانہ سے اس دوڑ میں گر پڑے ہوں انہیں یہ ادارہ اٹھا کر پھر چلنے کے قابل بنائے، اور جن لوگوں کو جدوجہد کے میدان میں اترنے کے لئے سہارے کی ضرورت ہو انہیں اس ادارے سے سہارا ملے۔ اس مقصد کے لئے اسلام نے از روئے قانون یہ طے کیا ہے کہ ملک کی تمام جمع شدہ دولت پر ڈھائی فی صدی سالانہ اور اسی طرح پورے تجارتی سرمایہ پر بھی ڈھائی فی صدی سالانہ زکوٰۃ وصول کی جائے، تمام عشری زمینوں کی زرعی پیداوار کا دس فیصدی یا پانچ فی صدی حصہ لیا جائے، بعض معدنیات کی پیداوار کا بیس فی صدی حصہ لیا جائے، مویشیوں کی ایک خاص تعداد پر بھی ایک خاص تناسب سے سالانہ زکوٰۃ لگائی جائے، اور یہ تمام سرمایہ غریبوں، یتیموں اور محتاجوں کی مدد کے لئے استعمال کیا جائے۔ یہ ایک ایسا اجتماعی انشورنس ہے جس کی موجودگی میں اسلامی سوسائٹی

کے اندر کوئی شخص زندگی کی ناگزیر ضروریات سے کبھی محروم نہیں رہ سکتا۔ کوئی محنت کش آدمی کبھی اتنا مجبور نہیں ہو سکتا کہ فاقے کے ڈر سے خدمت کی وہی شرائط منظور کر لے جو کارخانہ دار یا زمیندار پیش کر رہا ہو۔ کسی شخص کی طاقت اس کم سے کم معیار سے کبھی نیچے نہیں گر سکتی جو معاشی جدوجہد میں حصہ لینے کے لئے ضروری ہے۔

فرد اور جماعت کے درمیان اسلام ایسا توازن قائم کرنا چاہتا ہے جس میں فرد کی شخصیت اور اس کی آزادی بھی برقرار رہے اور اجتماعی مفاد کے لئے اس کی آزادی نقصان دہ بھی نہ ہو بلکہ لازمی طور پر مفید ہو۔ اسلام کسی ایسی سیاسی یا معاشی تنظیم کو پسند نہیں کرتا جو فرد کو جماعت میں گم کر دے اور اس کے لئے وہ آزادی باقی نہ چھوڑے جو اس کی شخصیت کے صحیح نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ کسی ملک کے تمام ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنا دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ملک کے تمام افراد جماعتی شکنجہ میں جکڑ جائیں۔ اس حالت میں ان کی انفرادیت کا آزادانہ ارتقاء سخت مشکل بلکہ غیر ممکن ہے۔ انفرادیت کے لئے جس طرح سیاسی اور معاشرتی آزادی ضروری ہے اسی طرح معاشی آزادی بھی بہت بڑی حد تک ضروری ہے۔ اگر ہم آدمیت کا بالکل استیصال نہیں کر دینا چاہتے تو ہماری اجتماعی زندگی میں اتنی گنجائش ضرور رہنی چاہیے کہ ایک بندۂ خدا اپنی روزی آزادانہ پیدا کر کے اپنے ضمیر کا استقلال برقرار رکھ سکے اور اپنی ذہنی و اخلاقی قوتوں کو اپنے رجحانات کے مطابق نشوونما دے سکے۔ راتب بندی کا رزق جس کی کنجیاں دوسروں کے ہاتھ میں ہوں، اگر فراواں بھی ہو تو خوشگوار نہیں کیونکہ اس سے پرواز میں جو کوتاہی آتی ہے محض جسم کی فربہی اس کی تلافی کبھی نہیں کر سکتی۔

جس طرح اسلام ایسے نظام کو ناپسند کرتا ہے اسی طرح وہ اس اجتماعی نظام کو بھی پسند نہیں کرتا جو افراد کو معاشرت اور معیشت میں بے لگام آزادی دیتا ہے اور انہیں کھلی چھٹی دے دیتا ہے کہ اپنی خواہشات یا اپنے مفاد کی خاطر جماعت کو جس طرح چاہیں نقصان پہنچائیں۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اسلام نے جو متوسط راہ اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے فرد کو جماعت کی خاطر چند حدود اور ذمہ داریوں کا پابند بنایا جائے، پھر اسے اپنے معاملات میں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ ان حدود اور ذمہ داریوں کی ساری

تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے، میں ان کا صرف ایک مختصر سا نقشہ آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

پہلے کسب معاش کو لیجیے۔ دولت کمانے کے ذرائع میں اسلام نے جتنی باریک بینی کے ساتھ جائز اور ناجائز کی تفریق کی ہے اتنی باریک کسی قانون نے نہیں کی۔ وہ چن چن کر ان تمام ذرائع کو حرام قرار دیتا ہے جن سے ایک شخص دوسرے اشخاص کو، یا بحیثیت مجموعی پوری سوسائٹی کو اخلاقی یا مادی نقصان پہنچا کر اپنی روزی حاصل کرتا ہے۔ شراب اور نشہ آور چیزوں کا بنانا اور بیچنا، فحش کاری اور رقص و سرود کا پیشہ، جوا، سٹہ، لاٹری، سود، قیاس اور دھوکے اور جاگیرے کے سودے، ایسے تجارتی طریقے جن میں ایک فریق کا فائدہ یقینی اور دوسرے کا مشتبہ ہو، ضرورت کی چیزوں کو روک کر ان کی قیمتیں چڑھانا، اور اسی طرح کے بہت سے وہ کاروبار جو اجتماعی طور پر ضرر رساں ہیں، اسلامی قانون میں قطعی طور پر حرام کر دیے گئے ہیں۔ اس معاملے میں اگر آپ اسلام کے معاشی قانون کا جائزہ لیں گے تو حرام طریقوں کی ایک طویل فہرست آپ کے سامنے آئے گی اور ان میں بہت سے وہ طریقے آپ کو ملیں گے جنہیں استعمال کر کے ہی موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں لوگ کروڑپتی بنتے ہیں۔ اسلام ان سب طریقوں کو ازروئے قانون بند کرتا ہے اور آدمی کو صرف ان طریقوں سے دولت کمانے کی آزادی دیتا ہے جن سے وہ دوسروں کی کوئی حقیقی اور مفید خدمت انجام دے کر انصاف کے ساتھ اس کا معاوضہ حاصل کرے۔

حلال ذرائع سے کمائی ہوئی دولت پر اسلام آدمی کے حقوق ملکیت تسلیم کرتا ہے مگر یہ حقوق بھی غیر محدود نہیں ہیں۔ وہ آدمی کو پابند کرتا ہے کہ اپنی حلال کمائی کو خرچ بھی جائز راستوں ہی میں کرے۔ خرچ پر اس نے ایسی قیود لگا دی ہیں جن سے آدمی ایک ستھری اور پاکیزہ زندگی تو بسر کر سکتا ہے مگر عیاشیوں پر دولت اڑا نہیں سکتا، نہ شان و شوکت کے اظہار میں اس قدر حد سے گزر سکتا ہے کہ دوسروں پر اس کی خدائی کا سکہ جمنے لگے۔ بیجا خرچ کی بعض صورتوں کو تو اسلامی قانون میں صراحتہً ممنوع ٹھیرایا گیا ہے، اور بعض دوسری صورتوں کی اگرچہ صراحت نہیں ہے لیکن اسلامی حکومت کو یہ اختیارات حاصل

ہیں کہ اپنی دولت میں ناروا تصرفات کرنے سے لوگوں کو حکماً روک دے۔

جائز اور معقول اخراجات سے جو دولت آدمی کے پاس بچے اُسے وہ جمع بھی کر سکتا ہے اور مزید دولت پیدا کرنے میں بھی لگا سکتا ہے۔ مگر ان دونوں حقوق پر پابندیاں ہیں۔ جمع کرنے کی صورت میں اسے نصاب سے زائد دولت پر ڈھائی فیصدی سالانہ زکوٰۃ دینی ہو گی۔ کاروبار میں لگانا چاہے تو صرف جائز کاروبار ہی میں لگا سکتا ہے۔ جائز کاروبار خواہ آدمی خود کرے یا کسی دوسرے کو اپنا سرمایہ دے، زمین یا آلات و اسباب کی صورت میں دے کر نفع و نقصان کا شریک ہو جائے، یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔ ان حدود کے اندر کام کرکے اگر کوئی شخص کروڑ پتی بھی بن جائے تو اسلام کی نگاہ میں یہ کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے، بلکہ خدا کا انعام ہے۔ لیکن جماعتی مفاد کے لئے وہ اس پر دو شرطیں عائد کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اپنے تجارتی مال پر زکوٰۃ اور زرعی پیداوار پر عُشر ادا کرے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنی تجارت یا صنعت یا زراعت میں جن لوگوں کے ساتھ شرکت یا اجرت کا معاملہ کرے ان سے انصاف کرے۔ یہ انصاف اگر وہ خود نہ کرے گا تو اسلامی حکومت اسے انصاف پر مجبور کرے گی۔

پھر جو دولت ان جائز حدود کے اندر فراہم ہو اس کو بھی اسلام زیادہ دیر تک سمٹا نہیں رہنے دیتا بلکہ اپنے قانون وراثت کے ذریعے سے ہر پشت کے بعد دوسری پشت میں اسے پھیلا دیتا ہے۔ اس معاملے میں اسلامی قانون کا رجحان دنیا کے تمام دوسرے قوانین کے رجحانات سے مختلف ہے۔ دوسرے قوانین کوشش کرتے ہیں کہ جو دولت ایک دفعہ سمٹ چکی ہے وہ پشت در پشت سمٹی ہی رہے۔ برعکس اس کے اسلام ایسا قانون بناتا ہے کہ جو دولت ایک شخص نے اپنی زندگی میں فراہم کی ہو وہ اس کے مرتے ہی اس کے قریبی عزیزوں میں بانٹ دی جائے۔ قریبی عزیز نہ ہوں تو دور کے رشتہ دار بحصہ رسد اس کے وارث ہوں، اور اگر کوئی دور پرے کا رشتہ دار بھی نہ ہو تو پھر پوری مسلم سوسائٹی اس کی حقدار ہے۔ یہ قانون کسی بڑی سرمایہ داری و زمینداری کو مستقل اور دائم نہیں رہنے دیتا۔ پچھلی ساری پابندیوں کے باوجود اگر دولت کے سمٹاؤ سے کوئی خرابی پیدا ہو بھی جائے تو یہ آخری ضرب اس کا ازالہ کر دیتی ہے۔۔